Al-Mīthāq ***(Research Journal of Islamic Theology)***
ISSN: 2791-0989 (P), 2791-0997 (E)
Volume 03, **Issue** 02, July-September 2024, **PP**: 184-191
Open Access at: https://almithaqjournal.org/

Article QR

سفر نامہ "اذنِ سفر دیا تھا کیوں" میں اسلامی تہذیب و تمدن کا مطالعہ

A Study of Islamic Civilization in Travelogue "Idhn-i-Safar Diyā Thā Kiyun"

1. Rizwana Bibi rizwana.phd289@gmail.com
Ph. D Scholar (Urdu), Sarhad University of Science and Technology, Peshawar.

How to Cite:	Rizwana Bibi. 2024: "A Study of Islamic Civilization in Travelogue "Idhn-i-Safar Diyā Thā Kiyun". Al-*Mīthāq (Research Journal of Islamic Theology)* 3 (02): 184-191.
Article History:	**Received**: 20-08-2024 · **Accepted**: 19-09-2024 · **Published**: 28-09-2024

Copyright:	**©The Authors**
Licensing:	This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

Conflict of Interest:	Author(s) declared no conflict of interest.

Abstract & Indexing

DRJI · ADVANCED SCIENCES INDEX · ADVANCED SCIENCE INDEX · CiteFactor · ASIAN Research Index · SCI · Google Scholar · تحقیقات · ADL ASIAN DIGITAL LIBRARY · EuroPub · اردو جرائد اشاریہ

Publisher

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

سفر نامہ "اذنِ سفر دیا تھا کیوں" میں اسلامی تہذیب و تمدن کا مطالعہ

A Study of Islamic Civilization in Travelogue "Idhn-i-Safar Diyā Thā Kiyun"

1. **Rizwana Bibi**
Ph. D Scholar (Urdu), Sarhad University of Science and Technology, Peshawar.
rizwana.phd289@gmail.com

Abstract

The art of writing a Travelogue has a significance in the transformation of a civilization. Through this literary genre, one can well know the apparent situation, geographical and environmental features of a country, it can be a depiction of that country's culture and civilization as well. First type of information may also know as apparent perspective. This apparent perspective can be cited easily almost in every travelogue writer's writing. If there is no style in this description, it may be felt spot narration only. The second type of information consists upon a country's culture, civilization, tradition and history which may also known as insight information. Every travelogue cannot interpret insight information. Only a deep vision of history can make it possible to deliver all such information. The travelogue of Islamic Republic Iran titled "*Idhn-i-Safar Diyā Thā Kiyun*" is written by renowned historian Nigar Sajjad Zaheer. The present paper aims to study the Islamic culture and civilization discussed in the travelogue.

Keywords: *Travelogue, Civilization, Style, Islamic Culture, History.*

سفر نامہ "اذنِ سفر دیا تھا کیوں" اور اسلامی تہذیب و تمدن

تہذیبی انعکاس کے اعتبار سے سفر نامہ نگاری کی صنف بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس صنف کے توسط سے ایک طرف کسی ملک کے ظاہری حالات اور جغرافیائی و ماحولیاتی خد و خال کو تو پتا چلتا ہی ہے، اس ملک کی تہذیب و ثقافت کا بھی بخوبی ادراک کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی معلومات کو خارجی پہلو سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خارجی پہلوؤں کی عکاسی تقریباً ہر سفر نامہ نگار کے ہاں ملتی ہے۔ اگر اس بیان کا اسلوب جاذب نہ ہو تو پھر یہ خارجی معلومات بھی سپاٹ بیانیے تک رہ جاتی ہیں۔ دوسری قسم کی معلومات جس میں کسی ملک کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور تاریخ کو موضوع بنایا جاتا ہے، داخلی معلومات کہلاتی ہیں۔ ہر سفر نامہ نگار داخلی معلومات کی ترسیل کا اہل نہیں ہوتا۔ تاریخ کا گہرا شعور ہی ان معلومات کی ترسیل کو ممکن بناتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے سفر پر مشتمل سفر نامہ "اذن سفر دیا تھا کیوں" معروف تاریخ دان ڈاکٹر نگار سجاد نے تحریر کیا ہے۔ مقالہ ہذا میں اس سفر نامے میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ مقصود ہے۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر ایک قادر الکلام شاعرہ، ادیبہ، نقاد، محقق اور مدرس کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ "قرطاس" کے نام سے کراچی میں ان کا اشاعتی ادارہ ہے جس کے تحت متعدد علمی، ادبی، تاریخی اور تدریسی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ وہ دو درجن کے قریب کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان کا ایران کا سفر نامہ "اذنِ سفر دیا تھا کیوں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو دلچسپ ہونے کے

ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی ہے۔ اس میں ایران کے تاریخی مقامات کے علاوہ علمی، ادبی اور روحانی مراکز کا حال دل کش پیرائے میں رقم کیا گیا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحبہ کا تعلق تاریخ اسلام سے ہے اس لیے انھوں نے جابجا تاریخی حوالوں سے متن کو معتبر بنایا ہے۔ قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ اس میں انھوں نے کسی بھی قسم کی مصلحت کوشی کو راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ انھوں نے مقامات مقدسہ اور آثار قدیمہ کے قلمی مرقعے ہی نہیں کھینچے بلکہ ان میں تاریخ و تحقیق کے رنگ بھی بھرے ہیں۔ اس سفر نامے سے اہلِ ایران کے رہن سہن، کھانے پینے کے آداب و انداز، عادات و اطوار اور رجحانات و میلانات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نگار ادیبہ اور شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ کراچی کے شعبہ اسلامی تاریخ کی سربراہ رہی ہیں۔ ان کے لیے ایک ایسے ملک میں جسے تہذیب کا اولین گہوارہ ہونے کا دعویٰ ہو، جس کے پاس ماقبل تاریخ کے زمانے کے آثار بھی کسی نہ کسی حد تک محفوظ ہوں، قم اور مشہد جیسے مذہبی مقامات ہوں، دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ انھوں نے سفر نامہ تحریر کرتے ہوئے صرف حال پر ہی نگاہ نہیں کی بلکہ ماضی کے اوراق پر بھی بھرپور نظر رکھی ہے۔ سفر نامے کے آغاز میں انھوں نے شبلی نعمانی کی کتاب "شعر العجم" سے یہ اقتباس درج کیا ہے:

> ایران ایک قدرتی چمن زار ہے۔ ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ قدم قدم پر آبِ رواں، سبزہ زار، آبشاریں ہیں۔ بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ زمرد بن گئی، بادِ سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔[1]

پھر انھوں نے شبلی کے اس قول کی تصدیق بھی کی۔ انھوں نے ایران کو ویسا ہی پایا جیسا کہ شبلی نے بیان کیا تھا۔ لیکن ان کی طرف سے تصدیق کا یہ عمل کورانہ نہیں تھا بلکہ یہ عمل ایران کے نو شہروں کی باقاعدہ سیاحت کے بعد وقوع پایا۔ ایرانی تہذیب و تمدن میں اس قدر دلکشی ہے کہ باہر سے جانے والے افراد چاہے وہ سیاحت کی غرض سے جائیں، ملازمت یا حصولِ علم کی غرض سے یا غایت کچھ بھی ہو، کچھ ہی عرصہ بعد وہ خود کو وہیں کا باسی محسوس کرتے ہیں۔ مقبول بیگ بدخشانی لکھتے ہیں:

> ایرانی تہذیب میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہے کہ جس اجنبی حکمران نے سرزمین ایران پر قدم رکھا، ایرانی بن کر رہ گیا۔[2]

ڈاکٹر نگار کے ہاں بھی قریب یہی احساس ان کی تحریر کے توسط سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نگار صاحبہ تاریخ دان ہیں اس لیے تقریباً ہر مقام پر انھوں نے موقع کی مناسبت سے قاری کو تاریخی معلومات فراہم کی ہیں۔ ایران اب جیسا ہے، ماضی میں ویسا ہرگز نہ تھا، نگار اس بابت تحریر کرتی ہیں:

> ایران انیسویں صدی میں ایک پس ماندہ ملک تھا جہاں طاقت کا مرکز بادشاہ کی ذات تھی۔ اس کا ہر فرمان قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ عوام کی نمائندگی تو کجا مجلسِ امراء تک نہ تھی جو بادشاہ اور عہدہ دارانِ سلطنت کو من مانی کرنے سے باز رکھتی۔ عوام کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انسانی حقوق کس چڑیا کا نام ہے؟ معمولی جرائم پر انسانیت سوز اور ہولناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ غریب کاشتکار کی زندگی انتہائی افلاس اور تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی، زمینیں شاہی خاندان کے افراد اور نوابوں اور رئیسوں کے تصرف میں تھیں جو ملک کو اپنی ذاتی جاگیر اور عوام کو اپنا ذاتی ملازم سمجھتے تھے۔[3]

ساتھ ہی انھوں نے پس ماندہ ایران کے جابر بادشاہ قبیلے "قاچار" کے مظالم اور تعیش پرستی کا مفصل ذکر کیا اور قاچاریوں کی بدولت ایران کی قومی دولت کے ضیاع کی بھی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ نگار لکھتی ہیں کہ انھوں نے ایران کا سفر اختیار کرنے سے قبل کچھ

ایرانی سفر نامے بھی پڑھے اور ان سفر ناموں میں سے وہ ایک فرانسیسی سیاح "فیریر" کے سفر کا خصوصی حوالہ دیتی ہیں جس نے اپنے سفر نامے میں انیسویں صدی کے پسماندہ ایران کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ فیریر کے سفر نامے سے پرانے ایران کی چند تصویریں دکھانے کے بعد نگار لکھتی ہیں کہ موجودہ ایران بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ ایران کی بدلتی ہوئی تصویر بیان کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے:

> ایک صدی میں ایران بہت بدل گیا ہے، ایک زیادہ خوبصورت، زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ پڑھا لکھا ایران ہمارے سامنے تھا۔ تہران کی شاہراہوں پر ہماری ٹیکسی دوڑ رہی تھی اور کئی باتیں کراچی سے مختلف اور قابلِ تعریف تھیں، ان میں سے ایک سڑکوں پر بل بورڈ کا نہ ہونا بھی تھا۔ اکا دکا اگر کوئی بل بورڈ نظر بھی آیا تو عورت کی تصویر کے بغیر، آج کے ایران نے اپنی عورتوں کو ہر کس و ناکس کی نظروں کی تسکین نہیں بننے دیا بلکہ محترم اور معزز بنا دیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ عورتیں گھروں میں بند ہیں بلکہ ہمیں ہر ایرانی شہر میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ہر محکمہ میں کام کرتی نظر آئیں۔[4]

نگار کھلے دل سے ایران کے بلدیاتی نظام کی تعریف کرتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی سے ایران کے شہروں کا موازنہ کرتی ہیں اور جن مقامات پر ایران کو خود سے آگے محسوس کرتی ہیں وہاں ایران کی تعریف کرتی ہیں۔ درج بالا حوالے میں ایران میں عورتوں کی تعظیم و تکریم کا بیان ملتا ہے لیکن ساتھ ہی نگار غیر جانبدارانہ ایک عجیب مشاہدہ تحریر کرتی ہیں:

> تہران کے بازاروں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک عجیب بات مشاہدہ میں آئی کہ یہاں ٹیکسی پر چار مختلف مسافر بھی بیٹھ سکتے ہیں یعنی اگر ایک مسافر نے ٹیکسی روکی اور بیٹھ گیا تو آگے کوئی دوسرا مسافر بھی وہی ٹیکسی استعمال کر سکتا ہے۔ مزید آگے کوئی خاتون بھی ہاتھ دے کر ٹیکسی روک سکتی اور مردوں کے ساتھ بلا جھجک جڑ کر بیٹھ سکتی ہے۔۔۔ دس پندرہ منٹوں کے دوران کئی عورتوں نے ٹیکسیاں رکوائیں جس میں پہلے سے ایک مرد آگے اور ایک یا دو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاتون پورے اعتماد سے دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھے مردوں کے ساتھ بیٹھ جاتی اور ٹیکسی آگے چل پڑتی۔[5]

نگار کے لیے یہ بات یقیناً حیران کن تھی اور ان کے قارئین کے لیے بھی کیونکہ روایت و رواج ایک طرف، مذہبِ اسلام کی رو سے یہ فعل بہر حال ناپسندیدہ ہے۔ نگار کو اگرچہ ایران بہت بھایا اور وہاں ان کی تاریخ دان فطرت کی تشفی بھی خوب ہوئی لیکن انھیں جہاں جو بات ناگوار گزری، انھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا۔ مثلاً ایرانی کھانے کا احوال ملاحظہ ہو:

> اپنا سامان رکھ کر ہم کھانے کی تلاش میں نکلے۔ مہمان سرائے کے منتظم کی اطلاع پر ہم نے سڑک پار کی تو ایک چھوٹا سا مطعم (ہوٹل) مل گیا، جہاں ہم نے چلو کباب کھائے۔ کھانے سے قبل starter کے طور پر ویٹر باریک سی سانچے میں بنی ہوئی روٹیاں اور ایک چھلکا اتری پیاز رکھ گیا، ہم چونکہ بھوکے تھے لہٰذا پیاز روٹی بھی شوق سے کھا گئے، اس کے بعد چلو کباب، یہ ایرانیوں کی وہ بنیادی غذا ہے جس نے بیس دن ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ ایرانی کھانے کے معاملے میں خاصے بد ذوق ہیں۔ چاول ان کی بنیادی غذا ہے، اس کے ساتھ اگر سیخ کباب ہیں تو یہ چلو کباب کہلائے گا اور اگر سفید چاولوں کے ساتھ سنکے ہوئے ٹماٹر ہیں تو یہ "جوجہ کباب" کہلائے گا، اگر سفید چاولوں پر سرخ زرشک (ترش کشمش) چھڑکی ہوئی ہو تو یہ "چلو زرشک" ہو جائے گا۔ سبزیوں میں وہ زیادہ تر پالک بناتے ہیں جن میں پھلیاں پڑی ہوتی تھیں، یہ اتنا پھیکا ہوتا ہے کہ زہر مار کرنا عذاب ہوتا ہے، دالوں میں

صرف چنے کی دال جس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دن بھر سیاحت کے دوران خواہ ہمیں گھر کی یاد نہ آئے، کھانے کے وقت اپنا پاکستان اور اپنے انواع و اقسام کے کھانے شدت سے یاد آتے تھے۔[6]

ایرانی کھانے کی توصیف میں ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

دوپہر میں ہم نے نزدیکی ریستوران سے از قسم جوجہ کباب کچھ کھایا۔ اس دفعہ وہ ایک پلیٹ میں مرغ بھی لے آئے۔ یہ مرغ کے دو بڑے قتلے تھے جو سرخ رنگ کے شوربہ قسم کی کسی چیز میں پڑے ہوئے انتہائی واہیات لگ رہے تھے۔ حسبِ سابق زہر مار کیا۔[7]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں۔ پھر اس سفر نامے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ نگار نے جہاں مناسب سمجھا وہاں الفاظ کے باقاعدہ معانی و مطالب بھی فراہم کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ قم میں بہنے والے قدیم دریا (جو اب خشک ہو چکا ہے) پر آباد بازار کے بارے میں لکھتی ہیں:

یہ "پل بازار"، "جِسر السوق" کہلاتا ہے۔ دیکھا جائے تو جِسر (یعنی پل) عربی لفظ ہے اور سوق بھی عربی لفظ ہے جس کے معنی بازار کے ہیں۔ فارسی میں بہت سے عربی الفاظ کی آمیزش یہاں طویل عرب اقتدار کی دین معلوم ہوتی ہے۔[8]

اس طرح کے مفاہیم یقینی طور پر قاری کی معلومات میں اچھا اضافہ ثابت ہوتے ہیں۔ دوران سفر نگار اور ان کے ساتھیوں نے مختلف مزاروں پر حاضری دی۔ مصنفہ نے ان مزاروں کی بابت ضروری معلومات سفر نامے میں پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر قم میں قیام کے دوسرے دن انہوں نے بوقتِ عصر سیدہ فاطمہ (امام موسیٰ کاظم کی صاحبزادی) کے روضے پر حاضری دی، وہ لکھتی ہیں:

یہ ایک وسیع و عریض احاطہ ہے جس میں میرے اندازے کے مطابق بیس ہزار افراد کے سما جانے کی گنجائش ہوگی داہنی جانب تین مرکزی عمارتیں ہیں ایک مدرسہ فیضیہ کی عمارت، دوسری کتب خانے کی عمارت اور تیسری روضہ فاطمہ کی عمارت جو سب سے زیادہ کشادہ ہے جبکہ بائیں جانب وسیع و عریض احاطے کے آخری سرے پر زیر تعمیر مسجد حضرت امام حسن عسکری ہے۔ ان عمارتوں میں پیلے اور نیلے پتھروں کا استعمال کیا گیا تھا۔[9]

نگار لکھتی ہیں کہ قم میں دیکھنے کی چار جگہیں ہیں جن میں ایک روضۂ فاطمہ، دوسرے کتاب خانۂ مرعشی، تیسرا موزہ اور چوتھی جگہ حوزۂ علمیہ ہے۔ مشہد اور قم میں زائرین کا سلسلہ ایک مخصوص تاریخ کا حامل ہے جس کا مذکور انگریز مورخ ایڈورڈ براؤن نے کچھ اس طرح کیا ہے:

انہوں (صفویہ) نے مشہد، قم اور دوسرے بلاد ایران کو بڑھا چڑھا کر مرجع انام بنا دیا اور اس طرح زائرین کا انبوہِ کثیر صرف ان کی سلطنت کے اندر ہی رہنے لگا۔[10]

قم سے علمی سند حاصل کرنا ایرانیوں کے لیے بہت افتخار کی بات ہے۔ نگار نے روضۂ فاطمہ پر دوبارہ حاضری لگوائی اور یہاں کے "موزہ" یعنی میوزیم کا دورہ بھی کیا۔ وہ لکھتی ہیں کہ میوزیم میں قرآن کے بعض نادر و نایاب نسخے ہیں۔ وہ نسخہ بھی ہے جس کی کاتب فتح علی شاہ قاچار کی بیٹی ام سلمہ تھیں۔ اس کے علاوہ قدیم سکے، بادشاہوں کی تصویریں، ہتھیار، برتن، قالین اور لکڑی کے دروازے بھی ہیں۔ لیکن نگار کو میوزیم میں موجود تصاویر دیکھ کر خاصی کوفت ہوئی۔ لکھتی ہیں:

نقاشی کے کئی نمونے تھے جن میں کئی تصاویر حضرت علی اور رسول اللہ ﷺ کی بھی تھیں۔ قاچار دور کی ایک تصویر میں حضرت علی اور رسول اللہ ﷺ کو ایک ساتھ بیٹھے دکھایا گیا تھا جبکہ رسول اللہ ﷺ کی گود میں حسن، حسین ہیں۔ اسی طرح ایک بہت بڑی نقاشی میں رسول اللہ کو نقاب پہنے دکھایا گیا ہے جبکہ ان کے ارد گرد اصحاب کرام ہیں، ہر تصویر پر اس صحابی کا نام لکھا ہوا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت سلمان فارسی کی تصویر ہے۔۔۔ یہ تصاویر رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول کی شخصیات کا سحر توڑنے کے مترادف تھیں، جن کے بغیر بھی آرٹ اور فن کی خدمت کی جا سکتی تھی۔ [11]

جو چیزیں قابلِ دید و تعریف ہیں، نگار ان کی دل کھول کر مدح کرتی ہیں۔ میوزیم دیکھ کر نگار اسی دن دوپہر کو قم سے بذریعہ ٹیکسی اصفہان روانہ ہو گئیں۔ قم سے اصفہان تک کا راستہ صحرائی تھا لیکن جب نگار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اصفہان میں داخل ہوئیں تو انہیں واضح تبدیلی محسوس ہوئی۔ حد درجہ سرسبز و شاداب، خوبصورت اور جدید طرز کا شہر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ انتہائی صاف ستھری سڑکیں، فٹ پاتھ، کیاریاں، پھولوں کے تختے اور چوراہے، ٹیکسی والے نے انہیں بتایا کہ دن میں تین مرتبہ شہر کی صفائی ہوتی ہے۔ اصفہان میں تین دن کا قیام تھا۔ ان کا ہوٹل "نقش جہاں" ایسے مقام پر واقع تھا کہ چہل ستون، ہشت بہشت، اور سی وسہ پل جو سب دیکھنے کی جگہیں تھیں، پیدل کے راستے پر تھیں۔ ہوٹل کے قریب اصفہان کی مرکزی سڑک خیابان تھی، یہ گزرگاہ ہی نہیں بلکہ شاپنگ کے لیے بھی بہترین جگہ تھی، کھانے پینے سے لے کر کتابوں تک ہر چیز کی دکانیں یہاں موجود تھیں۔ مصنفہ کی اگلی منزل ہشت بہشت تھی۔ حسبِ سابق یہاں بھی وہ اہم تاریخی معلومات فراہم کرتی ہیں اور ساتھ ہی ہشت بہشت کے نمایاں پہلو قاری کے سامنے لاتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

ہشت بہشت میں سب کچھ تھا، خوبصورت موسم، صاف ستھری چوبی نشستیں اور حور و غلماں کی مانند گردش کرتے ہوئے خوبصورت چہرے۔ یہاں کے بعض درخت کئی منزلہ بلند تھے جنہوں نے اوپر جا کر اپنی شاخیں پھیلا کر چھت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا بہشت میں قدرتی طور پر سایہ تھا۔ [12]

اصفہان سے روانگی سے پہلے ڈاکٹر نگار نے خیابان باغ گلدستہ میں عوامی کتب خانہ دیکھا جس کے دروازے پر فارسی میں لکھا تھا "مطالعہ روح کی غذا اور ذہنی بیماری کا علاج ہے"۔ نگار کو اس ذیل کے عناصر نے خاصا متاثر کیا۔ اصفہان کی عوامی لائبریری کے بارے میں لکھتی ہیں:

ایرانیوں میں مطالعہ کی اچھی عادت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہاں کتاب خانے، کتاب فروشی کی دکانیں، درسگاہیں دانش کدہ اور دانش گاہوں کی کمی نہیں۔ اس کتابخانۂ مرکزی و مرکز اطلاع رسانی شہر داری، اصفہان میں بھی تقریباً دو ہزار افراد روزانہ لائبریری اور یہاں فراہم کردہ مختلف سہولیات سے فائدہ اٹھانے آتے ہیں۔ [13]

ایران کی اس مخصوص تہذیب کے پیچھے ایک طویل ریاضت اور مدت ہے۔ محمد عظیم الحق جنیدی ایرانی تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایران پر اسلامی تسلط کے بعد زبان اور تمدن کے احیا اور ترویج میں پوری دو صدیاں صرف ہوئیں۔ عربوں نے قدیم ایرانی علما اور صاحبان فن کی خواہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں قدر کی اور ان سے ایرانی علوم و تمدن کے احیا میں مدد حاصل کی۔ [14]

کتب خانے کے اجمالی مذکور کے بعد نگار اس کتب خانے کا مختصر اعشار یہ بیان کرتی ہیں، جس سے ان کی کتابوں اور کتب خانوں میں دل چسپی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ نگار نے چہل ستون کا دورہ کیا جو دراصل شاہان صفوی کا دربار تھا۔ نگار تفصیل بیان کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ دربار کی عمارت بیس ستونوں پر کھڑی ہے، ان ستونوں کا عکس تالاب کے پانی میں نظر آتا ہے جس کی وجہ سے یہ چالیس ستون معلوم ہوتے ہیں۔ اب یہاں ایک میوزیم ہے، اس کی دیواروں پر وسیع و عریض تصویریں بنائی گئی ہیں جن میں مصوروں نے ایران کی تاریخ، جیسی وہ بیان کرنا چاہتے ہیں، محفوظ کرلی ہے۔ مقبول بیگ بدخشانی "تاریخ ایران" میں لکھتے ہیں:

> قدیم ایرانی تہذیب کا زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق ہے۔ تاریخی زمانہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ایران کے ملحقہ علاقوں، بابل و نینوا اور مصر میں رسم الخط وضع ہوا۔ رسم الخط اختیار کرنے سے ایران کے قدیم بادشاہوں نے اپنے کارناموں کو جاودانی حیثیت دینے کے لیے ملک کی بلند و بالا چٹانوں کو منتخب کیا اور تاریخ کے کچھ اوراق اہل فن کے تیشوں نے چٹانوں پر کندہ کر دیے۔ اس طرح تاریخ و تہذیب کا ابتدائی ورثہ اہل ایران کو ملا۔[15]

مصنفہ کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ہر جگہ ٹکٹ خرید کر جانا پڑتا تھا جس کی قیمت اگر ایرانیوں کے لیے تین سو تومان ہے تو غیر ملکیوں کے پندرہ ہزار تومان کا ہوتا ہے۔ ایران میں پانی بھی قیمتاً ملتا ہے۔ البتہ جہاں شہری حکومت کی طرف سے کولر لگے ہیں وہاں پانی مفت ہے۔ نگار کو ایران کے کرنسی ریٹ پر بھی خاصی کوفت ہوئی کیونکہ سو ڈالر کے عوض تین لاکھ سات ہزار تومان سنبھالنا واقعی مشکل امر ہے۔ ڈاکٹر نگار کی اگلی منزل سعدی کا مولد شیراز تھا۔ اس تاریخی شہر میں بہت کچھ دیکھنے کے لیے تھا مگر پروگرام یہ بنا کہ وہ حفظیہ، سعدیہ اور تخت جمشید دیکھ کر تہران کے لیے عازم سفر ہو جائیں گے۔ شیراز پہنچ کر ڈاکٹر نگار اور ان کے دونوں ساتھی پہلے حافظ کے مقبرے پر گئے۔ نگار سعدیہ سے نکلیں تو اگلی منزل تخت جمشید تھا۔ وہ لکھتی ہیں:

> ایران کے سفر میں مجھے سب سے زیادہ جس جگہ کو دیکھنے کا شوق تھا وہ یہی تخت جمشید تھا اس لیے نہیں کہ یہ شاہان گزشتہ کی عظمت رفتہ کی یادگار ہے بلکہ بہت سے مورخین زمین پر اولین انسانی تہذیب کے نقش پر اسی مرودشت میں بیان کرتے ہیں۔[16]

اس کے بعد نگار نے تخت جمشید اور متصل علاقوں کی مکمل تاریخ اور ان کی تباہی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قصر سعد آباد کی سیر کی جہاں دو بڑے محل ہیں، ایک "کاخ سفیر" جو ایران کے آخری بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کا محل تھا اور دوسرا "کاخ سبز" جو ان کے والد رضا شاہ کبیر کا محل تھا۔ نگار بتاتی ہیں کہ خمینی انقلاب کے بعد اب پورے سعد کو میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نگار تہران سے مشہد گئیں۔ اس شہر کو بھی حرم کا درجہ حاصل ہے ان کا وہاں قیام روضہ امام رضا کے قریب ہی تھا۔ جب یہ روضہ پر پہنچیں تو مغرب ہو چکی تھی ان کو اندر جانے کی اجازت مشکل سے ملی چونکہ ان کا لباس اسلامی نہیں تھا۔ اور وہ اس لیے کہ انہوں نے پاؤں میں موزے اور ہاتھوں میں دستانے نہیں پہنے تھے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر نوشاہی کے ایک مرید شکیل انھیں خواجہ ربیع بن خثیم کے مزار پر لے گئے خواجہ ربیع تابعی تھے ان کی آرام گاہ ایرانی فن تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ نگار اپنے سفر ایران میں وہ نیشاپور بھی گئیں، مشہد کے مغرب میں یہ مشہور اور قدیم شہر بڑے بڑے علما اور فضلا کا مولد اور مسکن رہا ہے اسی لیے انہیں نیشاپور کی سیاحت کی بڑی بے چینی تھی۔ نیشاپور میں ڈاکٹر نگار محمد غفاری کما الملک کے مقبرے پر گئیں جو ایران کے بہترین نقاش اور ہنر مندوں میں شمار ہوتے ہیں پھر شیخ فرید الدین عطار کے مقبرے پر پہنچیں ان کا اگلا پڑاؤ عمر خیام نیشاپوری کا مزار تھا۔ یہ ایک وسیع احاطے میں ہے جو ایک باغ کی شکل میں ہے عمر خیام اپنی رباعیات کے لیے مشہور ہیں۔ حقیقت میں وہ ریاضی، طب، فقہ، تاریخ اور لغت کے عالم تھے۔

مزار کے احاطے میں عمر خیام کا سنگ سفید کا ایک مجسمہ شیشے کے بکس میں بند نصب ہے، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کا آخری سفر طوس کا تھا جو غزالی اور فردوسی کا وطن ہے اور مدفن بھی ہے۔ نگار نے دورانِ تحریر ان اکابرین کی شخصیات کی کئی پرتیں قاری پر کھولی ہیں۔

خلاصہ بحث

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے سفر نامہ "اذنِ سفر دیا تھا کیوں" پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نگار کا مطمح نظر فقط سیر سپاٹا نہیں بلکہ وہ ہر مقام کے تاریخی پہلوؤں پر خصوصی نظر رکھتی ہیں اور کسی بھی مقام کی ہر ممکنہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ وہ کسی بھی مقام کو ذاتی تناظر میں نہیں دیکھتیں بلکہ ان کا زاویۂ نگاہ خاصی وسعت کا حامل ہے۔ چند ایک مقامات پر ہی ان کی ذاتی آراء ملتی ہیں وگرنہ کھانے پینے، رہن سہن یا دیگر روزمرہ کے معاملات کو انہوں نے تحریر میں اتنی جگہ نہیں دی، لباس یا زبان پر بھی نہ ہونے کے برابر بات کی گئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نگار تاریخ بیان کرنے کا عمل زیادہ اہم جانتی ہیں۔ ہاں ایران کے سیاسی معاملات پر وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً انہیں اس بات کا ازحد افسوس ہے کہ ایران کی پارلیمنٹ میں یہودی تو موجود ہیں لیکن کوئی سنی موجود نہیں اور یہ امر ایران کے کٹر شیعہ پن کی جانب مشار ہے۔ اسلوب کے اعتبار یہ سفر نامہ انتہائی سنجیدہ اور معلومات کا مرقع ہے۔ بعض مقامات پر قاری حال میں موجود ہوتے ہوئے بھی ماضی میں سفر کر رہا ہوتا ہے۔ حاصل الکلام یہ کہ مصنفہ نے سفر نامے میں جگہ جگہ اپنے تاریخی استاد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سفر نامہ ایک عام قاری کی نسبت تاریخ سے شغف رکھنے والوں کے لیے زیادہ دل چسپی کا حامل ثابت ہو سکتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1 نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، **اذنِ سفر دیا تھا کیوں**، (کراچی: قرطاس، 2016ء)، ص 11۔
2 مقبول بیگ بدخشانی، پروفیسر، **تاریخ ایران**، (لاہور: مجلس ترقی ادب، 1967ء)، ص ق۔
3 نگار سجاد، **اذنِ سفر دیا تھا کیوں**، ص 13۔
4 ایضاً، ص 17-18۔
5 ایضاً، ص 22-23۔
6 ایضاً، ص 26۔
7 ایضاً، ص 30۔
8 ایضاً، ص 25۔
9 ایضاً، ص 26-27۔
10 ایڈورڈ براؤن، **تاریخ ادبیات ایران**، مترجم: سید وہاج الدین احمد، (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1939ء)، ص 49۔
11 نگار سجاد، **اذنِ سفر دیا تھا کیوں**، ص 34۔
12 ایضاً، ص 47-48۔
13 ایضاً، ص 50۔
14 محمد عظیم الحق جنیدی، **مآثر عجم**، (لاہور: مکتبہ فانوس، 1994ء)، ص 8۔
15 مقبول بیگ بدخشانی، **تاریخ ایران**، ص: م۔
16 نگار سجاد، **اذنِ سفر دیا تھا کیوں**، ص 68۔